الایام : مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ وثقافت، کراچی جلد:۳، شمارہ:۱، جنوری۔ جون ۲۰۱۲ء

عبدالسلام ندوی اور تصوف

کبیر احمد جائسی

Abstract

Maulana, Abdus Salam Nadvi (1883-1956) one of the prominent student of Allama Shibli Nomani, wrote a detailed essay on Mysticism *(Tasawwuf ki Ijmali tarikh aur us per naqd-o-beheth)* published in 'Muarif' Azamgarh, India, from April 1935 in six episodes. Present paper is based on the same article, and a try to examine Nadvi's opinion about Mysticism.

مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنے انتقال سے اکیس برس قبل ''تصوف کی اجمالی تاریخ اور اس پر نقد و بحث'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون معارف اعظم گڑھ میں اپریل ۱۹۳۵ء سے شائع کروانا شروع کیا تھا جس کی چھ قسطیں معارف کے اکہتر صفحات میں شائع ہوئی تھیں۔ مولانا نے اس مضمون کے آغاز میں یہ نوٹ شائع کروایا تھا۔

"مجھ کو ایک زمانے میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ تصوف کی ایک مستقل تاریخ موجودہ مذاق کے مطابق مرتب کروں اس خیال کی بنا پر متعدد کتابوں سے تاریخ تصوف سے متعلق مختلف معلومات جمع کیے تھے لیکن بعض موانع سے یہ خیال عملی صورت میں نہ آسکا تاہم وہ پراگندہ معلومات اب تک محفوظ ہیں اور اب ان کو ایک مضمون کی صورت میں مرتب کرکے ناظرین معارف کی خدمت میں پیش کرتا ہوں کہ مالا یُدرک کُلّه لایُترک کُله۔"

اگرچہ یہ مضمون بقول مولانا عبدالسلام ندوی مکمل نہیں ہے تاہم اس میں درج متعدد باتیں ایسی ہیں جن پر بار بار غور کرنے اور ان کا تجزیہ وتحلیل کرکے کاروانِ علم کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ معارف اعظم گڑھ میں شائع شدہ بہت سے مضامین خواہ وہ مولانا عبدالسلام ندوی کے ہوں خواہ دوسرے علماء فضلاء کے اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان کا بار بار مطالعہ کیا جائے اور ہمارے ان بزرگوں نے اپنی بات جہاں ختم کی ہے وہاں سے آغاز کار کرکے ان کے پیش کردہ افکار وخیالات کا جائزہ لیتے ہوئے اُن کی اہمیت ومعنویت کو اُجاگر کیا جائے۔

ہماری محدود نظر سے تصوف کے موضوع پر اب تک جتنی تحریریں گزری ہیں وہ یا تو سراسر تصوف مخالف ہیں یا تصوف کو عین اسلام بتلانے والی۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی یہ تحریر نہ تو مجرد مخالفانہ تحریر ہے اور نہ ہی تصوف کو عین اسلام بتانے والی۔ اس تحریر میں اگر ایک طرف اہل تصوف کی بے اعتدالیوں کی نشاندہی کی گئی ہے تو دوسری طرف تصوف کے ان مثبت اثرات کو بھی اجاگر کیا گیا ہے جو مسلمانوں کی علمی اور عملی زندگی کو نئی سمت سفر دیتے رہے ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے زیر نظر مقالے کے ذریعے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ قدماء کا تصوف کیا تھا اور متاخرین کا دور آتے آتے کیا ہوگیا۔ یہ پورا مضمون طرح طرح سے اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

ہمارے نزدیک اس مضمون کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے انتہائی جرأت سے کام لیتے ہوئے ابن تیمیہ، ابن قیم اور ابن جوزی کی بہت سی ان باتوں کو بھی جگہ جگہ اپنی تحریر میں استعمال کیا ہے جن سے بیشتر علماء صرف نظر کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے بہت واضح الفاظ میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "قدماء کے دور کے بعد تصوف کتاب وسنت سے گزر کر مختلف علوم وفنون کا مجموعہ ہوگیا"۔ قرآن وسنت سے دوری کا نتیجہ یہ بھی

ظاہر ہوا کہ بہت سے لوگوں کے دلوں سے خوفِ خدا جاتا رہا اور وہ لوگ آنحضرت ﷺ کے نام نامی سے ایسی باتیں منسوب کرنے لگے جو آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے کبھی نکلی ہی نہ تھیں مثال کے طور پر ''تلبیس ابلیس'' کے حوالے سے مولانا عبدالسلام ندوی نے تحریر فرمایا کہ ''ابوعبدالرحمٰن سلمٰی (م۴۱۲ھ) نے صوفیہ کے لیے بہت سی حدیثیں وضع کیں'' عام طور سے ہمارے وہ علماء جو طبقہ صوفیہ کے ہمدرد ہیں اس بات کو کہنے سے گریز کرتے ہیں مگر مولانا عبدالسلام ندوی نے علمی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے اس حقیقت کی پردہ پوشی کی کوشش نہیں کی۔

علاوہ برایں مولانا عبدالسلام ندوی کی یہ جرأت بھی قابل داد ہے کہ انہوں نے اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی کے ممدوح ابوحامد غزالی کی کتاب احیاء العلوم کو احادیث باطلہ سے پرقرار دیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ (غزالی نے) ''یہ بیان کیا کہ جو ستارہ چاند اور سورج حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا تھا اس سے وہ انوار مراد ہیں جو حجابِ خداوندی ہیں یہ مشہور ستارے مراد نہیں۔ یہ کلام باطنیوں کے کلام کی جنس سے ہے''۔ میرے نزدیک اس سے بھی زیادہ جرأت مندانہ بیان مولانا عبدالسلام کا یہ ہے کہ ''اس قسم (احیاء العلوم وغیرہ) کی کتابوں کا سبب یہ تھا کہ یہ لوگ سنن اور آثار اور اسلام کا بہت کم علم رکھتے تھے''۔

مولانا عبدالسلام ندوی کے ان بیانات کو پڑھ کر ایک چونکا دینے والا علمی انکشاف یہ ہوتا ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین کو ۱۹۳۵ء یا یوں کہہ لیجئے کہ ۱۹۳۸ء تک تصوف کے بارے میں مولانا عبدالسلام ندوی کے خیالات سے کوئی اختلاف نہیں تھا ورنہ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے میں مولانا عبدالسلام ندوی کا یہ طویل مقالہ یا تو شائع ہی نہ کیا جاتا یا اختلافی نوٹ کے ساتھ ہی اس کی اشاعت ہوتی مگر یہ بات جب کی ہے جب مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح ''فجر الاسلام'' کے حوالے سے مولانا عبدالسلام ندوی نے تصوف اور امرد پرستی کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی مولانا سید سلیمان ندوی کا اختلاف ظاہر نہیں ہوتا جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جس زمانے میں مولانا عبدالسلام ندوی کا یہ مقالہ معارف میں شائع ہو رہا تھا اس زمانے میں مولانا سید سلیمان ندوی اپنے استاد بھائی کے افکار و خیالات سے پوری طرح متفق تھے اسی سلسلۂ سخن میں یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے فرقۂ حلولیہ

کے لوگوں کے اثر سے اہل تصوف پر امرد پرستی کے جو اثرات پڑے اس پر مختصر مگر جامع انداز سے جو کچھ تحریر فرما دیا ہے وہ بار بار پڑھنے کی چیز ہے اس کے علاوہ انہوں نے اس بات کو بطورِ خاص حوالوں کے ذریعے پیش کرنے کی سعی بلیغ کی ہے کہ ''قدماء کے دور کے بعد اسلامی ملکوں میں جو مختلف فرقے پیدا ہوئے ان فرقوں کے بہت سے لوگ صوفیوں کے گروہ میں اس طرح شامل ہوئے کہ ان کے بہت سے افکار و نظریات تصوف کا جزو بن گئے اور تصوف طرح طرح کے عقیدوں اور خیالات کا ''معجون مرکب'' بن گیا جو آج تک صوفیوں کے روحانی مرض کا سبب بنا ہوا ہے''۔

اس مضمون کا ایک اور خاص نکتہ یہ ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی کے نزدیک ''تصوف کے مختلف طریقوں میں جو طریقہ شریعت کے موافق اور بدعات و محدثات سے محفوظ تھا وہ طریقۂ نقشبندیہ تھا''۔ اس طریقے کے سلسلے میں ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ''یہ طریقہ آئین نبوت کے موافق اور ارشاد و ہدایت کے لیے موزوں ہے اسی بنا پر حضرت مجدد الف ثانی نے تصوف کی تجدید و اصلاح کے سلسلے میں اسی طریقے کی دعوت دی ہے اور متاخرین نے اس میں جن بدعتوں کا اضافہ کردیا تھا ان سے اس کو پاک کیا ہے''۔

یاد رہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی کا یہ خیال ۱۹۴۵ء کا ہے اگر وہ آج کے نقش بندی حضرات کو بہم دگر مختلف عقائد و افکار میں منقسم دیکھ لیتے تو یقین ہے کہ آج کے نقش بندی صوفیوں کے بارے میں ان کا یہ خیال نہ ہوتا جو گذشتہ سطور میں تحریر کیا جاچکا ہے۔

وجد و سماع کے سلسلے میں مولانا عبدالسلام ندوی نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگرچہ مختصر ہے مگر اس میں بعض نکات ایسے آگئے ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود طول وطویل بیانات اور اشارات پر بھاری ہیں مثلاً انہوں نے تحریر فرمایا ہے ''حضرت جنید بغدادی کا قول ہے کہ جب تم مرید کو سماع کی حالت میں پاؤ تو سمجھو کہ اس میں لہو ولعب کا مادہ باقی ہے''۔ اگر ایک طرف انہوں نے حضرت جنید بغدادی کا یہ قول نقل کیا ہے تو دوسری طرف خوف فساد خلق سے بے خطر ہوکر متاخرین صوفیہ کے بارے میں یہ تحریر فرمایا ہے ''متاخرین صوفیہ نے اس (یعنی سماع) میں اس قدر غلو کیا کہ اس کو قرآن پر ترجیح دی'' اسی غلو کی ایک مثال دیتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی نے محمد بن طاہر کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ انہوں نے ''مروجہ غنا کی بہت سی باتیں احادیث سے ثابت کرنا چاہی ہیں''۔

مولانا عبدالسلام ندوی کے اس مضمون کا ایک اور خاص نکتہ یہ ہے کہ انہوں نے متاخرین صوفیہ کی تمام گمراہیوں کا اصلی سبب علم (قرآن اور حدیث) سے بے نیازی کو قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے بہت سی مثالیں دے کر اپنی بات کی وضاحت کی ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی پیش کردہ تمام باتیں نہ صرف قابل غور ہیں بلکہ چونکا دینے والی بھی ہیں۔ یہ باتیں ''تصوف کی اجمالی تاریخ'' کے آخری حصے میں آئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ کن کن توہمات اور خود ساختہ عقائد کے اسیر ہوگئے ہیں۔ اس مضمون کو طوالت سے بچانے کی کوشش کے باوجود ہم مجبور ہیں کہ امام غزالی کا ایک اقتباس اور اس پر مولانا عبدالسلام ندوی کا تبصرہ نقل کریں۔ امام غزالی احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

''ربوبیت کے بعض اسرار ایسے ہیں کہ اگر کھل جائیں تو نبوت باطل ہوجائے اور نبوت کے بعض اسرار ایسے ہیں کہ اگر کھل جائیں تو علم باطل ہوجائے اور خدا شناس علماء کے بعض اسرار ایسے ہیں کہ اگر ان کو وہ ظاہر کردیں تو تمام احکام باطل ہوجائیں''۔

امام غزالی کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی نے مختصر ترین الفاظ میں جو تبصرہ کیا ہے وہ بار بار پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

''اس طریقہ اور اس تعلیم کا نتیجہ یہ تھا کہ صوفیہ خود قرآن وحدیث کی تعلیم نہیں حاصل کرتے تھے بلکہ جن لوگوں نے حدیثیں لکھی تھیں انہوں نے اپنے اپنے مجموعۂ حدیث کو ضائع کردیا، بہت سے صوفیہ لوگوں کو علم حدیث حاصل کرنے سے روکتے تھے اور قرآن و حدیث کے متعلق عجیب عجیب تاویلات کرتے تھے۔

محدثین کو الہامی علوم سے انکار نہیں ہے لیکن کوئی الہامی علم اس وقت تک قابل عمل نہیں ہوتا جب تک وہ شریعت کے موافق نہ ہو اس لیے الہامی علوم کی جانچ پڑتال کے لیے سب سے پہلے شرعی علوم کا حاصل کرنا ضروری ہے''۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے اس نامکمل مضمون کے آخر میں تحریر فرمایا ہے:

''فرقۂ اباحیہ کے لوگ جن کی مختلف قسمیں تھیں تصوف کے حلقے میں داخل ہوگئے اور چند شبہات پیدا کرکے تمام اعمال وعبادات کی پابندی ترک کردی اور حصولِ لذت میں مصروف ہوگئے ان لوگوں نے جن شبہات کی بنا پر ایسا کیا وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) تقدیر الٰہی میں جو کچھ لکھا جاچکا ہے اس کے خلاف نہیں ہوسکتا جن کی قسمت میں سعادت لکھی جاچکی وہ شقی نہیں ہوسکتے اور جو شقی لکھے جاچکے ہیں وہ سعید نہیں ہوسکتے اس لیے تمام اعمال وعبادات بے سود ہیں۔

(۲) خدا ہمارے اعمال سے بے نیاز ہے اور اس پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔

(۳) خدا کی رحمت عام ہے اور اس میں ہم لوگ بھی شامل ہیں۔

(۴) ریاضت ومجاہدہ کا مقصد تزکیۂ باطن ہے لیکن تمام اوصاف رذیلہ سے نفس کا تزکیہ ناممکن ہے اور اس لیے ریاضت ومجاہدہ بے کار چیز ہے۔

(۵) اور جن لوگوں کی ریاضت کے بعد صفائی باطن حاصل ہوجاتی ہے ان کے لیے شریعت کی پابندی غیر ضروری ہے، شریعت صرف عوام کے لیے ہے، اور یہ لوگ خاصانِ خدا ہیں۔

یہ لوگ اگرچہ صوفی نہیں تھے تاہم آگے چل کر تصوف پر اس کا اثر پڑا اور اس قسم کے بہت سے لوگ پیدا ہوگئے جو شرعی اوامر ونواہی کی پابندی نہیں کرتے تھے اور ''بے قید'' کہے جاتے تھے، حافظ وخیال کا کلام درحقیقت انہی شبہات کی آواز بازگشت ہے''۔

فارسی ادب کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں مولانا عبدالسلام ندوی کی اس رائے سے کہ ''حافظ وخیام کا کلام درحقیقت انہی شبہات کی آواز بازگشت ہے''۔ ایک نئی روشنی پاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے توفیق عطا فرمائے کہ اس اجمال کی جس قدر تفصیل ممکن ہوسکے قلم بند کردوں۔

افسوس ہے کہ اس بیان پر مولانا عبدالسلام ندوی کا مقالہ ختم ہوجاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے تصوف کے موضوع کو ۱۹۳۸ء تک یکسر فراموش نہیں کیا تھا۔ اس موضوع پر ان کے تین اور مضامین معارف میں شائع ہوئے تھے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۶ء کے معارف میں انہوں نے اپنا ایک مضمون ''تصوف کا اثر علوم وفنون پر'' پھر اکتوبر اور نومبر ۱۹۳۷ء کے معارف میں دو قسطوں میں ''صوفیانہ نظامِ اخلاق'' اور مارچ ۱۹۳۸ء میں ''تصوف کی تجدید و اصلاح'' شائع کروایا۔ اس کے علاوہ اپنے انتقال سے دس برس پہلے انہوں نے ایک مضمون ''حکمائے اسلام کا اخلاق'' کے عنوان سے معارف میں چار قسطوں میں شائع کروایا جو مئی ۱۹۴۶ء تا ستمبر ۱۹۴۶ء کے شماروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ان مضامین کو شائع کروانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے تصوف کے موضوع کو یکسر فراموش کر دیا تھا اگرچہ ان کا قلم ان کے نفس بازپسین تک چلتا رہا مگر تصوف کے موضوع پر پھر ان کی کوئی تحریر دیکھنے میں نہ آئی۔ مولانا عبدالسلام ندوی اپنے مضمون ''تصوف کا اثر علوم وفنون پر'' کی ابتدا ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''قدما صوفیہ کا دور تابعین و تبع تابعین کا دور تھا جس میں مذہبی گروہ کے سامنے علوم شرعیہ یعنی قرآن و حدیث، فقہ اور تفسیر کے سوا کچھ نہ تھا، صوفیہ بھی اسی مذہبی گروہ میں داخل تھے اس لیے قدماءِ صوفیہ علوم شرعیہ میں بڑا تبحر رکھتے تھے''۔

اس کے برعکس متاخرین صوفیہ کے بارے میں بہت واضح اور دوٹوک انداز سے اپنے اس نقطۂ نظر کو پیش کر دیا ہے جو انہوں نے ابن قیم جیسے علما کی تحریروں سے اخذ کیا تھا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''متاخرین صوفیہ کے دور میں تصوف قرآن و حدیث سے الگ ہوکر دوسرے دوسرے عقائد و خیالات کا مجموعہ ہوگیا اور اس معجون مرکب نے متاخرین صوفیہ کو قرآن مجید سے اس قدر ناآشنا کر دیا کہ جو لوگ قرآن مجید کی خدمت میں مصروف رہتے تھے ان کو چشم حقارت سے دیکھنے لگے''۔

اس خیال کے اظہار کے معاً بعد مولانا عبدالسلام ندوی نے مدارج السالکین، ج۳ کے حوالے سے ابن قیم کی جو رائے لکھی ہے وہ ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے بقول مولانا عبدالسلام ندوی:

> ''ابن قیم نے لکھا ہے کہ قائلین وحدۃ الوجود میں بعض لوگوں کا قول ہے (نعوذ باللہ) پورا قرآن شرک ہے اور توحید تو وہ ہے جو ہم کہتے ہیں''۔

قرآن کو شرک سمجھنے والوں کو جو شخص مسلمان سمجھے کیا اس کے فاتر العقل ہونے میں کوئی شبہ کیا جاسکتا ہے؟ مولانا عبدالسلام ندوی کا یہ مضمون اسی طرح کے چونکا دینے والے نکات سے بھرا ہوا ہے۔

تصوف کے حوالے سے ان کا دوسرا مضمون ''صوفیانہ نظامِ اخلاق'' ہے۔ یہ مضمون بھی مولانا عبدالسلام ندوی کے مخصوص طرزِ تحقیق و تنقید کا آئنہ دار ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جماعت ''فتیان''

پر جو کچھ لکھا ہے وہ خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ علاوہ برایں انہوں نے کسی موقع پر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور ''صوفیانہ نظام اخلاق'' میں ان کو جو جو باتیں شریعت کے مطابق اور انسانی ہمدردی سے لبریز نظر آئیں ہیں ان کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے فرقۂ قلندریہ اور ملامتیہ کے نظامِ اخلاق پر جو مختصر بحث کی ہے وہ بھی ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے اور اس موضوع پر ابھی بہت کچھ کام کرنے کی گنجائش محسوس ہوتی ہے۔ مولانا نے اس مضمون کا خاتمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''......صوفیانہ نظامِ اخلاق پر بغیر نقدو بحث کے عمل کرنا مناسب نہیں اس کا جو حصہ شریعت اور عرفِ عام سے مطابقت رکھتا ہے وہ بے شبہ قابل تقلید و اتباع ہے لیکن اس کے علاوہ جو سلبی اور انفرادی اخلاق ہیں یا فرقۂ قلندریہ اور ملامتیہ نے جو روش اختیار کی ہے وہ قابل بحث ونظر ہے''۔

تصوف ہی کے حوالے سے ان کا ایک مضمون ''تصوف کی تجدید و اصلاح'' ہے۔ یوں تو دیکھنے میں یہ مختصر سا مضمون ہے لیکن اس اختصار میں مولانا عبدالسلام ندوی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کو پھیلا کر ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اس مضمون کی ابتدا مولانا نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ''صوفیوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت پر جن لوگوں نے تنقید کی ہے، ان کی دوقسمیں ہیں ایک وہ لوگ ہیں جو سرے سے تصوف ہی کے قائل نہ تھے بلکہ اس کو ایک بدعت سمجھتے تھے اور معتزلہ، جہمیہ اورمسلمانوں کے دوسرے مبتدعانہ فرقوں کی طرح صوفیوں کو بھی ایک فرقہ سمجھتے تھے، علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور محدث ابن جوزی وغیرہ اس قسم کے لوگوں میں شامل ہیں اس لیے ان لوگوں نے تصوف پر جو کچھ لکھا ہے اس کو تنقید اور تردید تو کہہ سکتے ہیں تجدید و اصلاح نہیں کہہ سکتے ان لوگوں کا مقصد حریف کے جسم پر تلوار لگانا تھا نشتر لگا کر مرہم پٹی کرنا نہ تھا دوسری قسم ان لوگوں کی ہے، جو تصوف کے منکر نہ تھے بلکہ تصوف کے ذوق چشیدہ تھے البتہ تصوف پر شریعت کو مقدم سمجھتے تھے اس لئے تصوف میں جو چیزیں شریعت کے خلاف شامل ہوگئی تھیں ان سے تصوف کو پاک کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے اپنے زمانے کے مروجہ تصوف کے خلاف جو کچھ لکھا یا کہا ہے اس کو تصوف کی تجدید و اصلاح کہہ سکتے ہیں اور اس

مضمون میں ان بزرگوں کے تجدیدی کارناموں کو بیان کرنا مقصود ہے''۔

اس کے بعد انہوں نے جن چیزوں میں اصلاح کی ضرورت کومحسوس کیا ہے وہ یہ ہیں۔مجاز پرستی،نغمہ وسرود، پیرپرستی، طاعات شاقہ، فرقۂ قلندریہ، رسمی تصوف۔ علاوہ برایں مولانا عبدالسلام ندوی نے ''علم اور تصوف میں ربط'' کے عنوان سے بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اس عنوان کے یہ ابتدائی جملے قابل غور ہیں:

''ان تمام خرابیوں کا اصلی سبب یہ تھا کہ علم اور تصوف میں رفتہ رفتہ بیگانگی پیدا ہوگئی اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ علم دینوی وجاہت کا بھی ایک ذریعہ تھا اور علماء اور فقہاء کو دینی پیشوائی کے ساتھ دینوی حیثیت سے بھی جاہ و اعزاز اور منصب حاصل ہوتا تھا۔ اس لیے صوفیہ علم کو ایک دینوی چیز سمجھ کر علماء سے علیحدہ رہتے تھے''۔

بعدازاں صورغیبیہ کا مشاہدہ کے ذیلی عنوان سے مولانا عبدالسلام ندوی نے دومختلف رویوں کی مثالیں دیتے ہوئے مولانا روم اور مجدد الف ثانی کے خیالات سے اپنے قاری کو روشناس کرایا ہے۔ مولانا روم کا نظریہ تو یہ ہے کہ،

آئنۂ دل چوشود صافی و پاک
نقش ہا بینی برون برآب و خاک

اور مجدد الف ثانی کے نزدیک ''نہ یہ کوئی فضیلت ہے اور نہ روحانی صورتوں کے مشاہدے سے تصوف کا اصل مقصد حاصل ہوتا ہے''۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالسلام ندوی نے مجدد الف ثانی کے مکاتیب سے کئی اقتباسات نقل کیے ہیں۔ مولانا کے اس مختصر سے مضمون کے آخر کے یہ چند جملے خاص طور سے قابل غور ہیں:

''غرض مجددین تصوف کی اصلاحی تحریروں کو اگر جمع کیا جائے تو ان کا خاصہ بھی وہی ہوگا جو علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور محدث ابن جوزی نے لکھا ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہ لوگ تصوف کے بالکل منکر تھے اور لب ولہجہ سخت اختیار کیا تھا''۔